(فرمودہ ۱۷ اپریل ۱۹۳۲ء بمقام باغ حضرت مسیح موعود علیہ السلام قادیان)

گلے کی خرابی اور بعض دیگر تکالیف کے باعث مَیں زیادہ دیر نہیں بول سکتا اور اسی طرح اونچی آواز سے بھی نہیں بول سکتا۔ لیکن عید کا خطبہ چونکہ عبادت کا ایک جزو ہے[۱] اس وقت بولنا بھی ضروری ہے۔ اس لئے مَیں اختصار کے ساتھ دوستوں کو اس امر کی طرف توجہ دلاتا ہوں کہ شریعت کے بعض احکام بظاہر چھوٹے ہوتے ہیں لیکن ان کے اندر بڑی حکمتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔

مجھے یاد ہے ایک دفعہ ایک شخص اس بات پر مجھ سے گفتگو کر رہا تھا کہ داڑھی رکھنا ضروری ہے یا نہیں مختلف دلائل سننے کے بعد اس نے کہا۔ میں نہیں سمجھ سکتا روحانیت کی بنیاد چند بالوں کے رکھنے یا نہ رکھنے پر کیونکر ہو سکتی ہے۔ بظاہر یہ نہایت ہی دھوکہ دینے والا فقرہ تھا۔ ہم اس وقت علیحدہ گفتگو کر رہے تھے۔ ممکن ہے اگر مجلس میں یہ کہا جاتا۔ تو بعض کو اس سے ٹھوکر بھی لگتی۔ مَیں نے اس وقت اسی رنگ میں ایک ہی فقرہ میں اسے جواب دیا۔ مَیں نے کہا میں تسلیم کرتا ہوں کہ روحانیت کی بنیاد چند بالوں کے رکھنے یا نہ رکھنے پر نہیں لیکن روحانیت کی بنیاد رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت پر ضرور ہے جس سے میرا مطلب یہ تھا کہ داڑھی کا تعلق براہ راست روحانیت سے بے شک نہیں لیکن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کا تعلق براہ راست روحانیت سے ہے اور جب آپ کا ارشاد ہے کہ داڑھی رکھو[۲] تو گو داڑھی اپنی ذات میں روحانیت کا موجب نہ ہو لیکن جب آپ کا حکم توڑا جائیگا تو یقیناً ایسا انسان روحانیت سے محروم ہو جائے گا۔ اگر اس اعتراض کا میں تفصیلاً جواب دوں تو معلوم ہوگا کہ یہ نہایت ہی بودا ہے لیکن میں نے صرف بیاں اسے بطور مثال پیش کیا ہے کہ بعض چھوٹی باتیں بڑے اثرات پیدا کرتی ہیں۔ نمازوں میں صفوں کی درستی بظاہر معمولی بات ہے اور یہ کوئی اہم بات نظر نہیں آتی کہ ایک آدمی کچھ آگے کھڑا ہو جائے یا کچھ پیچھے لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ صفوں کو درست کرو ورنہ تمہارے دل ٹیڑھے ہو جائیں گے[۳] بات کتنی معمولی تھی لیکن نتیجہ کیسا عظیم الشان نکلا۔

مجھے اس کے متعلق ایک واقعہ یاد آیا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے زمانہ میں کچھ لوگوں میں روزوں کے متعلق بحث ہو رہی تھی کہ کس وقت روزہ رکھنا اور کس وقت افطار کرنا چاہیئے۔ ایک شخص کا خیال تھا کہ جب ایک شخص خدا تعالےٰ کے لئے سارا دن بھوکا رہتا ہے تو اگر اس نے

پو پھٹنے کے بعد کھانا کھالیا بلکہ اگر رویت آفتاب کے بعد بھی چند گھونٹ پانی پی لیا یا کچھ کھانا کھالیا تو اس میں کونسا حرج ہے۔ یہ کہنے والے کسی زمانہ میں جولاہوں کا کام کیا کرتے تھے۔ انہوں نے خواب دیکھا کہ تانی کو خشک کرنے کے لئے ایک کیلے کے ساتھ باندھا اور دوسری طرف دوسرے کیلے سے باندھنے گیا لیکن تانی کیلے سے دو انگل کے قریب کم رہ گئی لیکن کیلا کچھ دور تھا وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ہزار کوشش کی کہ کسی طرح تانی کیلے تک پہنچ جائے۔ مگر سب بے سود آخر گھبرا کر میں نے رشتہ داروں کو آواز دی کہ دوڑ کر آؤ، دو انگل کی وجہ سے میری تانی خراب ہوجائے گی۔ اس پر آنکھ کھل گئی اور سمجھ آگئی کہ چند منٹ آگے پیچھے روزہ رکھنے یا افطار کرنے کے متعلق میں جو کچھ بیان کر رہا تھا اللہ تعالےٰ نے مجھے اس کے متعلق آگاہ کیا ہے۔ تو بعض باتیں بظاہر چھوٹی ہوتی ہیں لیکن بلحاظ نتائج نہایت اہم ہوتی ہیں۔ انہی باتوں میں سے ایک یہ ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اوقات کے لحاظ سے عید الفطر اور عید الاضحیٰ میں فرق کیا ہے۔ وہ دیر سے پڑھائی جاتی ہے اور یہ جلدی کیونکہ اس کے متعلق حکم ہے کہ نماز کے بعد قربانی کی جائے۔ اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنا دستور یہ تھا کہ آپ قربانی کے گوشت سے ہی کھانا شروع فرماتے تھے اس دن روزہ تو نہیں ہوتا تھا لیکن نیم روزہ ضرور ہوجاتا تھا آپ صبح کچھ نہیں کھاتے تھے اور پھر قربانی کے گوشت سے افطار کرتے تو عید الاضحیٰ کی نماز جلد ادا کی جاتی۔ لیکن میں دیکھتا ہوں ہماری جماعت میں اس حکم کے متعلق بہت کم توجہ ہے کمزوروں کا لحاظ کرنے کی وجہ سے گویا یہ ایک قاعدہ بن گیا ہے کہ عید کی نماز ایسے وقت پر ہو جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریق کے مطابق نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ باتیں معمولی ہیں اور جماعت کی تربیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسے امور میں ڈھیل دی جاسکتی ہے لیکن اس کا بھی ایک وقت اور ایک حد ہونی چاہیئے۔ ہماری جماعت کی عمر ۴۴ سال ہوگئی ہے اور متواتر بلا ناغہ یہ ڈھیل چلی آتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس وقت تک یہاں ایک نماز بھی اس وقت پر نہیں ہوئی ہوگی جو احادیث میں آتا ہے۔ آج ساڑھے آٹھ بجے کا وقت مقرر تھا مگر ۹ بجے نماز پڑھائی گئی۔ اور اب کہ میں خطبہ پڑھا رہا ہوں بلکہ خطبہ کا بھی ایک حصہ بیان کر چکا ہوں نہ صرف عورتیں بلکہ مرد بھی نماز پڑھنے کے لئے چلے آرہے ہیں اس اندازہ کو مدنظر رکھتے ہوئے۔ ۱۰ بجے وقت ہوا اور دس بجے سورج وسط کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ حالانکہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سورج نیزہ بھر اونچا ہوتا تو عید الاضحیٰ کی نماز ادا کی جاتی۔ اور اس لحاظ سے اگر سوا چھ بجے سورج کا طلوع ہو تو نماز سات بجے تک ہوجانی چاہیئے۔ لیکن پرانی عادت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے نو بجے پڑھی اور اب بھی بعض لوگ عید پڑھنے کی خواہش سے برابر چلے آرہے ہیں۔

مَیں سمجھتا ہوں اب ضروری ہے کہ یک لخت تو نہیں، تھوڑا تھوڑا کم کرتے ہوئے ہمیں نماز کو ٹھیک وقت پر لانا چاہیئے۔ عید کے ایام آپس میں ملنے جُلنے کے لئے ہوتے ہیں۔ اگر عید کے دن صبح کی تیاری لمبی ہو جائے اور پھر نماز اور خطبہ ہو تو آدھا دن تو اسی میں خرچ ہو جائے گا۔ اور باقی وقت قربانی کرنے اور کھانے پینے میں لگ جائے گا۔ حالانکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کا منشاء یہ ہے کہ عید کے دن باہمی تعلقات بڑھائے جائیں[۸]

دوسری بات مَیں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ عید درحقیقت اس بات کا نشان ہے کہ ہمیں اپنی قربانیاں کسی مقصد کو مدِنظر رکھ کر کرنی چاہئیں۔ اور پھر جب کوئی خاص مقصد سامنے ہو تو کسی قربانی سے دریغ نہ کرنا چاہیئے۔ دوسری چیزوں کی طرح اسلام نے قربانی میں بھی اصلاح کی ہے۔ باقی مذاہب کی بعض قربانیاں بظاہر بہت خوبصورت نظر آئیں گی لیکن وہ درحقیقت بالکل لغو اور بے فائدہ ہونگی عبادت کے متعلق بعض قوموں میں ایسی قربانیاں پائی جاتی ہیں جن کا کوئی فائدہ نہیں مثلاً بعض لوگ اُلٹے لٹکے رہتے ہیں[۹]۔ مَیں نے خود ایک شخص کو دیکھا جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ گیارہ سال سے مسلسل چھت سے ٹانگیں باندھ کر لٹکا ہوا ہے رات کے وقت وہ ہاتھ زمین پر ٹیک لیتا تھا اور یہی اس کا سونا تھا۔ مَیں نے خود تو نہیں دیکھا لیکن کہتے تھے وہ اسی طرح آٹا گوندھتا اور روٹی پکاتا ہے۔ جب ہم گئے اس وقت وہ آٹا گوندھنے کی تیاری کر رہا تھا۔ لوگ دُور دُور سے اس کی زیارت کو آتے تھے اور وہ بہت بزرگ سمجھا جاتا تھا۔ بظاہر تو یہ بہت بڑی قربانی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس کا فائدہ کیا۔ اسی طرح بعض لوگ سورج کی طرف دیکھنا شروع کرتے ہیں اور برابر دیکھتے رہتے ہیں یہاں تک کہ وہ غائب ہو جائے[۱۰] پھر بعض سردیوں کے موسم میں سرد پانی میں کھڑے رہتے ہیں[۱۱] اور بعض گرمیوں میں ارد گرد آگ جلا کر بیٹھے رہتے ہیں[۱۲] یہ سب کچھ کرتب اور تماشا تو بے شک ہے لیکن دنیا کو یا ایسی مشقت اٹھانے والے کی ذات کو اس سے کیا فائدہ ہوُا۔ اسلام ہمیں بتاتا ہے کہ قربانی وہ ہے جس کا نفع تمہاری ذات کو یا دنیا کو پہنچے۔ پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ قربانی وہ ہے جس سے خدا کو نفع پہنچے اور اسی خیال کے ماتحت لوگ ایسی ایسی تکالیف اُٹھاتے اور سمجھتے تھے کہ اس طرح خدا کو مزا آتا ہے۔ وہ خدا کے مزے کو بھی ایسا ہی سمجھتے تھے جیسا کہ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ ایک امیر زادہ کا قصہ سُنایا کرتے تھے کہ باپ کے مرنے کے بعد جب اسے تین لاکھ روپیہ ملا تو وہ دوستوں میں بیٹھ کر مشورہ کرنے لگا کہ اسے کس طرح خرچ کیا جائے۔ وہ بازار میں گیا اور بزاز کو کپڑا پھاڑتے دیکھا۔ اس کے کان میں چِر چِر کی آواز جو آئی تو اسے بہت بھلی معلوم ہوئی۔ اور اس نے دوستوں سے آکر کہا۔ مجھے روپیہ خرچ کرنے کا بہت اچھا مصرف معلوم ہو گیا ہے اور نوکروں کو حکم دے دیا کہ کپڑوں کے تھان لا لا کر انہیں پھاڑتے رہو اور اس طرح ایک دن میں وہ چار پانچ سو کا کپڑا دھجیاں کر کر کے ضائع کر دیتا[۱۳] ایسی تکالیف اُٹھانے

والوں نے خدا تعالیٰ کو بھی اس امیرزادہ کی طرح سمجھ رکھا تھا کہ انسان اگر اپنی دھجیاں اُڑاتے تو اُسے مزا آتا ہے۔ لیکن اسلام نے آکر بتایا کہ قربانی بندہ کے اپنے نفع کے لئے ہے۔ فنا دراصل بقاء کی کڑیوں میں سے ایک کڑی ہے تم اس لئے فنا نہیں ہوتے کہ خدا کو مزا آئے بلکہ اس لئے کہ خود تمہارے اندر ایک نئی چیز پیدا ہو۔ اور اگر یہ نہیں ہوتی تو تم اپنے آپ کو ضائع کر رہے ہو بلکہ خدا تعالیٰ کے غضب کو بھڑکاتے ہو۔ اسے تمہیں ترقی دینا مقصود ہے نہ کہ دُکھ دینا۔

اللہ تعالیٰ کا مقصد یہ ہے کہ انسان ترقی کرتے کرتے اس مقام پر پہنچ جائے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ یہ عید دراصل اس بات کی یاد ہے کہ ہمیں لغو قربانیوں سے پرہیز کرنے کے ساتھ مفید قربانی سے کبھی بھی پہلوتہی نہ کرنی چاہیئے۔ ایک طرف یہ ہمیں سبق دیتی ہے کہ ہر ذرہ جو ضائع ہوتا ہے وہ خدا تعالیٰ کی ناراضگی کا موجب ہوتا ہے اور دوسری طرف یہ بتاتی ہے کہ اگر کسی مقصد کے لئے تمہیں اپنی قیمتی جان بھی دینی پڑے تو بلا تامل دیدو گویا ایک طرف یہ عید ہمیں اپنے ذرہ ذرہ کو بچانے کا سبق دیتی ہے۔ اور دوسری طرف بڑی سے بڑی چیز کی قربانی سکھاتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اجتہادی غلطی کے ماتحت اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کی خاطر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو قربان کرنا چاہا لیکن چونکہ یہ ایک ایسی قربانی تھی جو محض بے فائدہ تھی اور جس سے کوئی مقصد پورا نہیں ہوتا تھا۔ اس سے نہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات کو کوئی فائدہ تھا اور نہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی ذات کو اور نہ ہی دنیا کو۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس سے روک دیا۔ اور فرمایا۔ کہ یہ قربانی ہماری خوشی کا موجب نہیں۔ مانا تم رؤیا کے پورا کرنے والے ہو لیکن یہ تخیل ہمارے حکم کے مطابق نہیں۔ گویا بتایا کہ لغو قربانی آج سے مٹائی جاتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک اور قربانی قائم کی اور وہ اس رؤیا کی تعبیر تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے لخت جگر اور اس کی والدہ کو ایک بے آب و گیاہ صحراء میں چھوڑ آئے اور اس غرض سے چھوڑ آئے کہ خدا تعالیٰ کا گھر آباد ہو اور لوگ اس کا ذکر کریں۔ تلوار سے اگر وہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ذبح کر دیتے تو یہ اتنی بڑی قربانی نہ تھی اپنے ہاتھ سے اپنے بیٹے کو ذبح کرتے وقت اتنا تو لحاظ کرتے کہ تیز چھری سے یہ کام کرتے۔ اور یہ کام ایک منٹ میں ہو جاتا لیکن اسے ایک ایسے جنگل میں چھوڑ آنا جہاں سو سو میل تک کھانا پانی نہ مل سکتا ہو اور جہاں حدِ نظر تک نہ کوئی قافلہ ہو اور نہ آبادی۔ گویا اسے ایسی موت میں مبتلا کرنا تھا جو چھری سے ذبح کر دینے کے مقابلہ میں بہت زیادہ تکلیف دہ تھی جس کے ساتھ بھوک اور پیاس بھی وابستہ تھی۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس قربانی سے حضرت

ابراہیم علیہ السلام کو نہیں روکا۔ وہی خدا جس نے تیز چھری سے ذبح کرنے کے وقت کہا تھا یہ لغو ہے، فضول ہے، اس کی ضرورت نہیں۔ اس سے زیادہ خطرناک قربانی کرتے ہوئے دیکھ کر نہ صرف یہ کہ منع نہیں کرتا۔ بلکہ فرماتا ہے ہمارا منشا یہی ہے۔ وہ رحیم و کریم و شفیق ہستی ہے جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے گلے پر چھری چلانے سے روک دیا اس نے اُسے مکّہ میں چھوڑنے سے نہ روکا بلکہ خود اس کا حکم دیا۔ اس کی یہی وجہ ہے کہ چھری سے ذبح کر دینے کے کوئی معنے نہ تھے اور اس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ لیکن غیر ذی زرع جنگل میں چھوڑ آنے کے معنے تھے، اس سے خدا تعالیٰ کی عبادت کو قائم کرنا مقصود تھا۔ اگر حضرت ابراہیم علیہ السّلام حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کو چھری سے ذبح کر دیتے تو اس کا کیا فائدہ تھا۔ زیادہ سے زیادہ ایماندار لوگ مزے لے لیکر یہ حکایت بیان کرتے۔ اور جو کمزور ایمان والے ہوتے، وہ زیادہ سے زیادہ اسی نقطۂ نگاہ سے اسے دیکھتے جس سے فری تھنکر سوسائٹی کے بانی نے دیکھا۔ فرانس کا ایک لڑکا جو بعد میں دہریت کا بانی ہوا۔ وہ اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ دس بارہ سال کی عمر میں وہ اپنے باپ کے ساتھ پہلی دفعہ گرجا میں گیا۔ وہ کہتا ہے خوش قسمتی سے (لیکن ہم تو اسے بدقسمتی ہی کہیں گے) پادری صاحب نے اس وقت اسحاقؑ کی قربانی پر وعظ کیا۔ (عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت اسحٰقؑ کی قربانی کی گئی تھی نہ کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی) اور بتایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا کی رضا حاصل کرنے کے لئے اپنے اکلوتے بیٹے کو ذبح کر دیا۔ جوں جوں پادری صاحب یہ بیان کرتے مجھے خیال ہوتا کہ مَیں بھی اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ اگر میرا باپ بھی مجھے ذبح کر کے خدا کو خوش کرنا چاہے تو کیا ہو۔ اس خیال کا مجھ پر اس قدر غلبہ ہوا کہ مجھے یقین ہو گیا کہ میرا باپ مجھے ضرور ذبح کر ڈالے گا۔ جونہی وعظ ختم ہوا، مَیں دوسرے دروازہ سے بھاگ گیا اور سمندر کے کنارے پہنچا۔ امریکہ کو ایک جہاز جا رہا تھا اس میں سوار ہو گیا۔ ماں باپ کے لئے میرے دل میں کوئی محبت نہ رہی اور مَیں نے خیال کیا کہ یہ ظالم ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی مجھے خدا سے بھی نفرت ہو گئی اور مَیں نے دوسروں کو بھی اپنا ہم خیال بنانا شروع کر دیا۔ آہستہ آہستہ دہریوں کی ایک بڑی جماعت بن گئی۔ یہ لوگ لاکھوں کی تعداد میں اخبار اور رسالے شائع کر رہے ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ دنیا خدا کا انکار کر دے۔ تو ممکن تھا کہ اگر حضرت ابراہیمؑ حضرت اسمٰعیلؑ کو ذبح کر دیتے تو اور بھی کئی لوگ کہہ اُٹھتے کہ ہم ایسی ظالمانہ تعلیم اور ایسے خدا کو نہیں مانتے۔

لیکن جس قربانی کا خدا نے حکم دیا وہ کتنی زبردست ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ آج تک خدا تعالیٰ کی عبادت اس گھر سے وابستہ ہے جس کا قیام حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ذریعہ ہوا۔ مکّہ کی آبادی اور اس بات کا علم کہ اللہ تعالیٰ کی توحید کا مرکز اور سرچشمہ مکّہ ہے، یہ تمام باتیں حضرت اسمٰعیلؑ

کی قربانی سے ہی وابستہ ہیں۔

پس یہ عید کا دن ہمیں دو سبق دیتا ہے۔ ایک عدمِ قربانی کا اور دُوسرا قربانی کا۔ ایک تو یہ کہ کوئی ایسی قربانی نہ کرو جس کا کوئی نتیجہ نہ ہو۔ اور دوسرے یہ کہ جب نتیجہ نکلنے والا ہو تو عزیز سے عزیز چیز کی قربانی سے بھی دریغ نہ کرو۔ اس زمانہ میں اس کی مثال یہ ہے کہ جان کی قربانی اگرچہ اعلیٰ درجے کی قربانی سمجھی جاتی ہے لیکن اللہ تعالےٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ اس سے روک دیا۔ اور دوسری طرف اموال اور اوقات کی قربانی کا حکم دیا اور فرمایا جو اس سے پیچھے ہٹتا ہے وہ راندۂ درگاہِ الٰہی ہے۔ اور یہ بھی اسی عید کی تشریح ہے کہ جو قربانی لغو اور بے نتیجہ ہے اس سے بچو اور مفید کو اختیار کرنے میں کسی قسم کا پس و پیش نہ کرو۔

پس مومن کو ہمیشہ یہ امر مدِّنظر رکھنا چاہیئے کہ کوئی کام ایسا نہ کرے جس سے اُسے یا دُنیا کو کوئی فائدہ نہ پہنچتا ہو۔ اور جس سے کوئی فائدہ ہو اس سے ہرگز ہرگز دریغ نہ کرے یہی وہ رُوح ہے جو اسلام پیدا کرنا چاہتا ہے اور جس کے بغیر ترقی نہیں ہو سکتی۔ (الفضل ۲۶ اپریل ۳۲ء ص ۵)[۱۷]

---

[۱] زرقانی شرح موطا امام مالک جزء اوّل ص ۳۲۹۔ المنتقیٰ من اخبار المصطفیٰ ص ۱۰۶۔ نیل الاوطار جزء ثالث ص ۱۹۲، ص ۱۹۷

[۲] سنن ابی داؤد کتاب الترجّل باب فی اخذ الشارب۔ [۳] صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ باب تصویۃ الصفوف الخ

[۴] اخبار بدر قادیان ۸ اپریل ۱۹۰۹ء ص ۳۲

[۵] المصنف جزء ثالث ص ۲۸۶ مطبوعہ بیروت ۱۹۷۱ء۔ نیل الاوطار جزء ثالث ص ۱۷۱۔ [۶] سنن کبریٰ جزء ثالث ص ۲۸۲

[۷] نیل الاوطار جزء ثالث ص ۱۷۷۔ [۸] المغنی لابن قدامہ جلد ۲ ص ۳۹۹ طبع دوم ۱۳۶۷ھ

[۹] انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجس اینڈ ایتھکس ص ۳۳/۱۱۔ [۱۰] الملل والنحل امام شہرستانی جلد ۳ ص ۲۵ حاشیہ

[۱۱] انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجس اینڈ ایتھکس ص ۳۳/۱۱۔ [۱۲] الملل والنحل امام شہرستانی جلد ۳ ص ۲۵۵-۵۶ حاشیہ
انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجس اینڈ ایتھکس ص ۳۳/۱۱

[۱۳]۔

[۱۴]۔ ابراہیم ۱۴ : ۳۹

[۱۵]

[۱۶]

[۱۷] تبلیغ رسالت جلد ۱۰ ص ۵۳-۵۵ پر مندرجہ عبارت سے یہ مفہوم مستنبط ہوتا ہے۔